بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

اشتراکیت کے جس خطرے کی طرف ہم نے گذشتہ اشاعت میں اشارہ کیا تھا افسوس ہے کہ وہ خطرہ نہ صرف زیادہ قریب آرہا ہے بلکہ شدت بھی اختیار کرتا چلا جارہا ہے۔ اُس کی آمد سے پہلے جو نشانیاں بالعموم ظاہر ہوتی ہیں یا بربادی کی جن نشانیوں کے جلو میں یہ آتا ہے وہ زیادہ واضح ہوتی جارہی ہیں اور یوں احساس ہوتا ہے کہ اگر خداوند تعالیٰ نے دستِ غیب سے اس کے روکنے کے انتظامات نہ کیے تو یہ مقدس سرزمین سرخ فوج سے تاخت و تاراج ہو گی اور یہاں بھی اسلام اور مسلمانوں کا وہی حشر ہو گا جو سمرقند، بخارا، اور تاشقند یا دوسرے اشتراکی ممالک میں ہو چکا ہے۔

خطرے کی پہلی علامت ملک کا اقتصادی بحران اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی ہر آن بڑھتی ہوئی بے روزگاری اور ضروریاتِ زندگی کی کمیابی ہے۔ یوں تو ۱۹۶۵ء کی جنگ کے بعد ہی معاشی حالات دن بدن خراب ہونے شروع ہو گئے اور انہوں نے کسی منزل پر بھی بحالی کی طرف کروٹ نہیں لی لیکن خاص طور پر گذشتہ تین سالوں سے انہوں نے بڑی تشویشناک صورت اختیار کر رکھی ہے۔ ۱۹۶۸ء کا قریب قریب پورا سال اور ۱۹۶۹ء کا کچھ حصہ فیلڈ مارشل ایوب خاں کی آمریت سے نجات حاصل کرنے میں صرف ہو گیا۔ اور اس پورے عرصہ میں ملک میں غیر یقینی حالات کی وجہ سے تجارت اور صنعت و حرفت کو غیر معمولی نقصان پہنچا۔ ان حالات میں جبکہ جمہوریت کی صبح طلوع ہوا چاہتی تھی، چند ایک غیر ذمہ دار سیاست دانوں کی عاقبت نا اندیشی اور بے جا ضد کی وجہ سے ملک پھر مارشل لا کی زد میں آگیا۔ چند ماہ خوف و ہراس میں گذر گئے اور سرمایہ دار طبقہ مستقبل کے اندیشوں کی وجہ سے سرمایہ لگانے میں متامل رہا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ سرمایہ کاری کا دائرہ مسلسل سکڑنے لگا اور ملک پر معاشی بدحالی اور

بیروزگاری کے مہیب سائے چھانے لگے۔ اس بحران نے جرائم اور دوسری معاشرتی برائیوں میں اضافہ کیا۔ رشوت ستانی کا بازار گرم ہوا۔ عوام کے اندر اپنے مستقبل کے بارے میں بددلی پھیلی خصوصاً نوجوان طبقہ بیروزگاری کی وجہ سے سخت پریشانی کا شکار رہا اور اس کے اندر معاشرے سے بغاوت کے رجحانات بڑی تیزی کے ساتھ اُبھرے لگے۔

سرمایہ کاری میں کمی کی وجہ سے ملک کی پیداوار میں تشویشناک کمی ہوئی جس سے حکومت کی آمدنی بھی کم ہوگئی اور امورِ مملکت کو چلانے کے لیے وہ محصولات کی شرح میں اضافہ اور افراطِ زر کی پالیسی اختیار کرنے پر مجبور ہوئی۔ اب اس وقت صورتِ حال یہ ہے کہ ایک طرف تو پیداوار میں کمی کی وجہ سے آمدنی کے ذرائع کم ہوتے جا رہے ہیں اور دوسری طرف محصولات میں اضافہ کی وجہ سے بنیادی ضروریات کی قیمتیں بھی بڑی تیزی کے ساتھ بڑھ رہی ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ متوسط اور غریب طبقوں کی کمر ٹوٹ گئی ہے۔ ان کے لیے آرام اور سکون سے زندگی بسر کرنا تو ایک طرف رہا جسم اور روح کے رشتے کو قائم رکھنا دوبھر ہوتا جا رہا ہے۔ یہ اندوہناک معاشی حالات آنے والے خطرے کی دہائی دے رہے ہیں۔

سیاسی حالات معاشی حالات سے بھی دگرگوں ہیں۔ عوام کے اندر سیاسی اعتبار سے اس وقت طمانیتِ قلب پیدا ہوتی ہے جب انہیں اس امر کا احساس ہوتا ہے کہ وہ دھونس، دھاندلی کے بغیر اپنی پسند کے لوگوں کو ملک کی حکمران قوت بنانے پر قادر ہیں لیکن اگر اس کے برعکس وہ یہ محسوس کرنے لگیں کہ اُن کی حیثیت بھیڑ بکریوں کی سی ہے جنہیں شورش پسند قوتیں اپنی مرضی سے جس طرف چاہیں ہانک کر لے جا سکتی ہیں اور اُن کے وجود کا مقصد صرف اسی قدر ہے کہ ان کا ریلا طالع آزماؤں اور اقتدار کے حریصوں کو بہا کر مسندِ اقتدار سے ہمکنار کر دے تو اُن کے اندر شدید محرومی کا احساس اُبھرتا ہے۔ اور یہ وہ احساس ہے جس سے فسطائیت کی راہ ہموار ہوتی ہے۔ انسان کے دل میں جب یہ بات بیٹھ جاتی ہے کہ اُسے بہر طور غلام ہی رہنا ہے اور اس کی قسمت میں کوئی تبدیلی ممکن نہیں تو پھر اُسے ملک کی قسمت سے بھی کوئی دلچسپی باقی نہیں رہتی۔ وہ پھر

اپنی بلا سے بُوم بسے یا ہُما رہے

کے سے مُردہ احساسات کے ساتھ سیاسی تبدیلیوں کو ایک غیر متعلق تماشائی کی حیثیت سے دیکھنے کا عادی ہوتا ہے۔ فسطائی رجحانات رکھنے والے لوگوں کے لیے ایسے حالات بڑے سازگار ہوتے ہیں اور وہ قوت کا مظاہرہ کر کے اس طرح کے نیم جان لوگوں کی گردنوں پر بڑی آسانی سے مسلّط ہو جاتے ہیں۔

سیاسی حالات کی اِس سازگاری کے ساتھ ساتھ فسطائیت کو نا اہل انتظامیہ بھی بڑی قوت بہم پہنچاتی ہے۔ اور جو راستہ اسے برسوں میں طے کرنا ہوتا ہے۔ وہ اس کی مدد سے مہینوں نہیں بلکہ ہفتوں میں طے کر لیتی ہے۔ بدقماش، نوکر شاہی کا وجود فسطائی انقلاب کا پیش خیمہ ہوتا ہے جس معاشرے میں عوام کو ہر وقت اپنی جان کے لالے پڑے رہیں، جس میں ان کی عزت اور آبرو کے تحفظ کا کوئی معقول انتظام نہ ہو، جس میں انہیں اپنے جائز حقوق کے حاصل کرنے کے لیے بھی رشوت دینی پڑے جس میں غنڈے اور بدکردار لوگ بالکل بے خوف ہو کر لوگوں پر دستِ ظلم دراز کرتے رہیں، جس میں معصوم بچوں اور بے بس عورتوں کا اغوا ڈاکہ زنی اور معمولی معمولی بات پر قتل و غارت زندگی کے معمولات بن جائیں اور ان کی روک تھام کی کوئی سبیل نظر نہ آتی ہو۔ وہاں عوام کو امورِ مملکت سے آخر کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟ وہ جان و مال اور عزت و آبرو کے تحفظ کے لیے اپنی آزادی تک کو قربان کرنے کے لیے آمادہ ہو جاتے ہیں۔ اور ان بگڑے ہوئے حالات میں جب انہیں یہ بات سُجھائی جاتی ہے کہ آمریت کی بے رحم جکڑبندیاں ہی ان سماج دشمن عناصر کو مذموم سرگرمیوں سے باز رکھ سکتی ہیں تو وہ ان جکڑبندیوں کو عافیت کا حصار سمجھتے ہوئے ان کے تحت رہنا گوارا کر لیتے ہیں۔

اشتراکی انقلاب کی آمد کی ایک بڑی علامت عوام کے جذبات میں اشتعال اور سیاسی رہنماؤں کی اشتعال انگیزیاں ہیں۔ جو لوگ اشتراکی انقلاب کا داعیہ لے کر اُٹھتے ہیں وہ چونکہ اس امر سے واقف ہوتے ہیں کہ یہ انقلاب غیر فطری ہے اور اس میں معمولی سی اقلیت کو اکثریت پر مسلّط کرنا مقصود ہوتا ہے اس لیے جب تک عوام کی غور و فکر کی صلاحیتوں کو بالکل مفلوج نہ کر دیا جائے۔ اس وقت تک یہ انقلاب برپا نہیں ہو سکتا۔ اس لیے اشتراکی بیک وقت چار قسم کی چالیں چلتے ہیں۔ ان کی پہلی کوشش یہ ہوتی ہے کہ ملک کے اندر جو فرد یا گروہ بھی کسی احترام کا مستحق ہو سکتا ہے۔ یا لوگ اس کی بات سننا

گوارا کر سکتے ہیں۔ اسے نہایت ذلیل ہتھکنڈوں کے ساتھ معاشرے میں بدنام کیا جائے۔ اور تقریروں، تحریروں اور بیانات سے اس کا اس طرح استخفاف کیا جائے کہ عوام اس کی بات سننا تو کجا اس کے وجود سے نفرت کرنے لگیں۔ اسے ملک و ملت کا غدار، سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کا ایجنٹ، عوام کا دشمن، عوامی مفادات کا مخالف، غیر ملکی طاقتوں کا آلۂ کار، اقتدار کا حریص، طالع آزما اور خائن کی حیثیت سے پیش کیا جاتا ہے تاکہ اس کا بیشتر وقت اور صلاحیتوں کا بیشتر حصہ اپنے دفاع میں صرف ہوتا رہے اور اشتراکی زعما اس پر تابڑ توڑ حملے کر کے اسے سنبھلنے اور کسی تعمیری کام کی طرف دل جمعی کے ساتھ متوجہ ہونے کا موقع نہ دیں۔ اشتراکی انقلاب کے بارے میں یہ بات بطورِ اصول سمجھ لینی چاہیے کہ یہ انقلاب ایسے حالات میں آتا ہے جب ملک عظیم شخصیتوں کے وجود سے بالکل خالی ہو چکا ہو۔ یا خالی کر دیا گیا ہو یا کم از کم عوام کو یہ باور کرایا جا چکا ہو۔ کہ یہ ملک باعظمت، ایماندار اور ملک و ملت کے خیر خواہوں کے وجود سے یکسر خالی ہو چکا ہے اور اس میں لے دے کر اب ایک ہی شخصیت باقی رہ گئی ہے جو ساری انسانی خوبیوں کا مرقع اور قائدانہ صلاحیتوں کا پیکر ہونے کی وجہ سے قوم کی بگڑی بنانے پر تنہا قادر ہے۔ اس کی ذات کے علاوہ باقی سب نااہل اور وطن دشمنی اور ملک و ملت کی محبت سے عاری ہیں۔ اس مقصد کے حصول کے لیے اشتراکیت کے علمبردار ملک کی باوقار اور بلند شخصیتوں کو گرانے میں پوری قوت صرف کر دیتے ہیں۔ یہ اشتراکی پروگرام کا ایک ضروری حصہ ہے جس کا مقصد ملک کو قیادت کے اعتبار سے ویرانہ بنانا ہوتا ہے تاکہ اس کی پہنائیوں میں ایک آواز کی گونج کے علاوہ کسی دوسری آواز کی گونج سنائی نہ دینے پائے اور لوگ صرف اسی آواز کے پیچھے دیوانوں کی طرح چلتے رہیں۔

اس پروگرام کا دوسرا حصہ یہ ہے کہ لوگ فکری اعتبار سے یا تو بالکل تہی دامن ہو جائیں تاکہ ان کے پتلے اشتراکی نظریات کو بڑی آسانی کے ساتھ باندھا جا سکے یا ان کے افکار و نظریات میں اس قدر انتشار پیدا ہو جائے کہ وہ گھبرا کر ان سے دامن کش ہو جائیں۔ یہی وجہ ہے کہ اشتراکی انقلاب ایسے معاشرے میں آتا ہے جہاں افکار کے نخل یا تو بالکل ٹھنٹھ ہوں یا ان کی آب و تاب بالکل مسلوب ہو چکی ہو تاکہ اکاس بیل کی بے رونقی عوام پر واضح نہ ہو سکے۔ مارکس کے نظریے کے مطابق اس انقلاب کو

سب سے پہلے برطانیہ اور فرانس جیسے صنعتی ممالک میں آنا چاہیے تھا۔ کیونکہ ان میں طبقاتی منافرت زرعی ممالک کی بہ نسبت کہیں زیادہ ہوتی ہے مگر یہ انقلاب مارکس کی سائنٹفک پیش گوئی، جو اس کے تاریخی عمل کے طویل مشاہدے اور مطالعہ کا نتیجہ تھی اور جسے اشتراکی تاریخ کی اضطراری چال سمجھ کر ناگزیر عمل قرار دیتے ہیں، روس جیسے زرعی ملک میں برپا ہو گیا۔ وجہ صاف ظاہر ہے کہ روس کے بعض حصے فکری اعتبار سے بالکل لق و دق صحرا کا نقشہ پیش کرتے تھے اور بعض حصے پریشان فکری کا شکار تھے اور یہ ماحول اشتراکیت کو بڑا راس آتا ہے۔

اشتراکی انقلاب تاریخ کے سائنٹفک عمل کے مطابق برطانیہ اور فرانس میں اس لیے برپا نہ ہو سکا کہ یہ ممالک نہ تو قیادت کے اعتبار سے چٹیل میدان تھے اور نہ افکار و نظریات کے لحاظ سے ویرانے تھے۔ یہاں سیاسی مدبرین، بلند پایہ مفکرین کی ایک ٹیم موجود تھی جو آزادی کے ساتھ مختلف مسائل کے بارے میں سوچتی اور رائے زنی کرتی اور ہر معاملے کے حسن و قبح پر پوری طرح غور کر کے اپنے خیالات عوام میں پھیلاتی تاکہ ان کے اندر مسائل کو سمجھنے اور فیصلے کرنے کی صلاحیت پیدا ہو۔ اور وہ کسی چیز کو نہ تو اندھے جوش میں قبول کریں اور نہ جھوٹے پراپیگنڈے سے متاثر ہو کر مسترد کر دیں۔ جس قوم کے اندر غور و فکر کی آزادی ہو اور جسے ہر بات ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ سوچنے کا سلیقہ آتا ہو اس میں اشتراکیت کبھی راہ نہیں پا سکتی۔

تاریخ کا یہ ایک المیہ ہے کہ بعض بے عقل لوگوں نے اشتراکیت کے مزاج کو جانے بغیر اُسے ان ممالک میں مُسلّط کرنے کی کوشش کی جو فکری اعتبار سے بڑے شاداب تھے اور جن کی شادابیوں کی داستانیں انسانی کمالات کے زریں کارناموں کی حیثیت سے تاریخ میں محفوظ ہیں۔ ان ممالک میں جب چند سرپھروں نے اس قسم کی احمقانہ جدوجہد کی تو اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ قوم کے اندر ایک خوفناک کشمکش شروع ہو گئی جس نے اسے تباہ کر کے رکھ دیا۔ مشرقِ اوسط خصوصاً مصر اور شام اس قسم کی غیر عاقلانہ اور غیر حقیقت پسندانہ کوششوں کے بڑے بھیانک مناظر پیش کرتے ہیں۔ ان لوگوں نے بعض اہم حقائق اور تاریخ کے بعض اہم فیصلوں کو نظر انداز کرتے ہوئے اور مطلق العنان فرمانروا اور کسی بہت بڑے انقلاب کا

ہیرو بننے کے لیے یہ سوچنا تک گوارا نہ کیا کہ کیا ان ممالک کی ذہنی فضا اشتراکیت کے لیے موزوں بھی ہو سکتی ہے؟ اگر یہ انقلاب برطانیہ اور فرانس جیسے ممالک میں نہیں آسکا جن کا پورا فکری ماحول تا حال مادّیت سے عبارت ہے اور جس کے سیاسی، معاشی اور معاشرتی ڈھانچے مادّیت پر استوار ہیں تو یہ انقلاب آخر ان ممالک میں کس طرح کامیاب ہو سکتا ہے جن کا نہ صرف ذہنی اور فکری پس منظر بلکہ اجتماعی زندگی کے سارے ڈھانچے اخلاق اور روحانیت کی اساس پر قائم ہوں اور ان میں زندہ رہنے اور زندہ رکھنے کی پوری قوت بھی موجود ہو۔ جو شخص بھی اشتراکیت کے مزاج سے واقف ہے وہ اس بات کو اچھی طرح جانتا ہے کہ سرمایہ داری اور اشتراکیت میں کوئی نوعی فرق نہیں۔ فرق جو کچھ ہے وہ منزل کا ہے سرمایہ دارانہ نظام کو اگر عملی میدان میں مادّیت اور الحاد کا پہلا قدم قرار دیا جائے تو اشتراکیت اس کا دوسرا قدم ہے جو اسی سمت اٹھتا ہے جس سمت کہ کسی قوم کو الحاد دھکیل کر لے جاتا ہے ایک مفکر نے یہ کہا ہے کہ جس چیز کو سرمایہ داری پرچون کے بھاؤ بیچتی ہے اشتراکیت اسے تھوک کے بھاؤ فروخت کرتی ہے۔ اشتراکیت درحقیقت سرمایہ داری کے دائرے کو وسعت اور اس کے تسلط کو زیادہ مضبوط اور ہمہ گیر بنانے کا ظالمانہ پروگرام ہے۔ فکر و عمل کے میدان میں اس یکجائی کے باوجود اگر اشتراکیت ان سرمایہ دارانہ ممالک میں کامیاب نہیں ہو سکی جن کے عوام ذہنی لحاظ سے بیدار ہیں تو اس کی کامیابی کے ان ممالک میں کیا امکانات ہو سکتے ہیں۔ جن کے باشندوں کے فکر و عمل کے محرکات الحاد اور مادّیت سے بالکل جدا گانہ ہیں۔ جن مسلم ممالک میں بھی اس حقیقت کو نظر انداز کرتے ہوئے اشتراکیت کو ٹھونسنے کی کوشش کی گئی وہاں سوائے کشت و خون کے کوئی دوسرا نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔

پھر اس ضمن میں یہ بات بھی ذہن نشین رہنی چاہیے کہ اشتراکی تحریک درحقیقت یاس و قنوطیت کی پیداوار ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام نے جن معاشی، اخلاقی اور معاشرتی برائیوں کو جنم دیا ہے ان کی اصلاح کے لیے یہ نظام چونکہ بالکل عاجز ہے اور اصلاح کی جو تدبیر بھی اختیار کی جاتی ہے وہ ہزاروں دوسری برائیوں کو جنم دیتی ہے۔ اس لیے قنوطیت کے شکار بعض مفکرین نے انسانی فلاح کے لیے یہ راستہ تجویز کیا کہ انسان کو بپھرے ہوئے حیوان کی سطح پر رکھ کر اس سے معاملہ کیا جائے۔ اس تصوّر کو

انسان کے بارے میں مسیحی نقطۂ نظر کہ وہ پیدائشی گنہگار ہے، سے بھی تقویت حاصل ہوئی اور انسان کے بارے میں غلطی سے یہ فیصلہ کر لیا گیا کہ اس پر جب بھی اعتماد کیا جائے گا تو وہ اس اعتماد کا نااہل ثابت ہوگا، اُسے جب بھی آزادی ملے گی تو وہ اس آزادی سے ناجائز فائدہ اٹھائے گا، اُسے جب بھی اختیارات حاصل ہوں گے تو وہ ان اختیارات کو غلط استعمال کرے گا اور اس کے ہاتھ میں جب بھی دولت آئے گی تو وہ لازمی طور پر اُسے غلط راستوں پر خرچ کرے گا۔ اس لیے انسانی فلاح کی صرف ایک صورت ہے کہ اُسے حیوانوں کی طرح جکڑ کر رکھا جائے اور نپے تلے چارے پر زندگی بسر کرنے پر مجبور کر دیا جائے۔ یہ نقطۂ نظر نہ صرف انسانیت کی تذلیل ہے بلکہ انسان کے بارے انتہائی مایوسی کا تصور بھی ہے۔ چنانچہ دیکھیے کہ جن ممالک میں بھی اشتراکیت کا طوفان اُٹھا ان میں سب سے پہلے انسان اور اس کے مستقبل کے بارے میں مایوسی کی ایک عام فضا قائم کرنے کی کوشش کی گئی اور انسانوں کی باور کرایا گیا کہ اُن کے اردگرد پھیلی ہوئی بُرائیاں صرف اشتراکیت کے ذریعے ہی دُور کی جاسکتی ہیں اور اصلاح کا کوئی دوسرا پروگرام کسی طرح مؤثر ثابت نہیں ہو سکتا۔ اگر سرمایہ دار ممالک اشتراکیت کے مادی فلسفے کو ماننے کے باوجود اُس کے اس فیصلے سے اختلاف رکھتے ہیں اور اپنے معاشی ڈھانچوں میں بعض تبدیلیاں کر کے خاطر خواہ نتائج حاصل کر چکے ہیں تو مایوسی کے اس نظریہ کو وہ قوم کس طرح اپنا سکتی ہے جو مایوسی کو کفر سمجھتی ہے اور انسان کو اس کائنات میں خدا کا نائب خیال کرتی ہے۔

مسلمانوں کے اندر جو لوگ اشتراکیت کے علمبردار بن کر اٹھے ہیں، وہ معاشرے میں یاس و قنوطیت پھیلانے کی پوری کوشش کر رہے ہیں کیونکہ اس کے ذریعہ انسان اپنے ماضی، اپنی اقدارِ حیات اور اپنے رہنماؤں سے مایوس ہو کر اشتراکیت کا قلادہ گلے میں پہننے پر آمادہ ہو سکتا ہے مگر انہیں اس امر پر غور کرنا چاہیے کہ کیا وہ مسلمانوں کے دل و دماغ میں مایوسی کے ان خیالات کو اچھی طرح جاگزیں کر سکتے ہیں اس معاملے میں انہیں دو باتوں کے بارے میں ٹھنڈے دل سے غور کرنا چاہیے۔

(۱) مادیت لازمی طور پر انسان کے اندر یاس و قنوطیت کے جذبات پیدا کرتی ہے یا دوسرے لفظوں میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ مایوسی الحاد اور مادیت کا خاصہ ہے۔ قوموں کی زندگی پر یہ نظام وہی اثرات مترتب کرتا ہے، جو شراب کسی انسان کے مزاج اور اعصاب پر مترتب کرتی ہے۔ جو قومیں

(باقی صفحہ ۱۴۴ پر)